اردو میں سیاحتی وارضیاتی ادب کا ایک نادر نمونہ۔شمالی پاکستان: توضیحی مطالعہ

ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر*

Abstract:

"Shumali Pakistan" written by Rasheed Akhtar Nadvi consists of two parts. First one is a narration of the importance of western area of Pakistan and the second one is a compilation of different selections from some travelogues. This article is a critical analysis of "Shumali Pakistan". Writer is of the opinion that the cited book helps a lot in understanding role of western parts of our country in national politics.

''شمالی پاکستان''، رشید اختر ندوی کی پاکستان کے شمالی علاقوں کی سیاحتی ودفاعی اہمیت کے بارے میں ایک قابلِ توجہ تالیف ہے۔ یہ تالیف شمالی پاکستان کے عنوان سے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۹۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس تالیف کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ اُردو واقبالیات کے زیر اہتمام ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۰ء کے دورانیے میں ایم اے اُردو کی ایک طالبہ عقیلہ رانی نے 'شمالی پاکستان (رشید اختر ندوی) کا تجزیاتی مطالعہ' کے زیرِ عنوان ایم اے اُردو کا ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ یہ مقالہ کل چار ابواب پر مشتمل تھا۔ یہ مقالہ غیر مطبوعہ اور مملوکہ شعبہ اُردو واقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ہے۔ 'شمالی پاکستان' پر ایم۔اے کی سطح پر مقالے کی تسوید رشید اختر ندوی کی اس تالیف کی اہمیت اور وقعت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ طالبہ عقیلہ رانی نے اپنے وقیع مقالے میں 'شمالی پاکستان' کی سیاحتی، ارضی اور جمالیاتی خوبیوں کو اپنے تجزیئے کی بنیاد بنایا ہے اور یہ درست رجحان ہے۔

لیکن میرے نزدیک 'رشید اختر ندوی' کی تالیف 'شمالی پاکستان' پاکستان کے سیاحتی اور ارضیاتی ادب کا نمونہ نہیں، رشید اختر ندوی کی اپنے اچھوتے موضوع پر ایک نہایت اہم سیاسی تصنیف ہے۔ 'شمالی پاکستان' کا ارض پاکستان کی سیاست اور سلامتی کے ساتھ جو نہایت گہرا تعلق ہے غالباً رشید اختر ندوی وہ پہلے پاکستانی دانش ور اور ادیب ہیں جنہوں نے اس نہایت حساس، حکمت عملی کے متنوع پہلوؤں پر حاوی سنجیدہ موضوع پر قلم اُٹھایا۔ دراصل اس اہم تالیف کی تحریر کی حقیقی غرض وغایت بھی یہی تھی یعنی شمالی پاکستان کی دفاعی، سیاسی اور حکمت عملی سے جڑی

* شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ہوئی اہمیت اور معنویت کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش، یقینی طور پر رشید اختر ندوی اپنی کوشش میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ رشید اختر ندوی نے کتاب کے آغاز میں لیکن حرفِ آغاز کے بعد ایک ضروری وضاحت رقم کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آپ کو غالباً پہلی بار ایک ایسی کتاب پڑھنے کو مل رہی ہے جس میں نصف حصہ مصنف کی اپنی تحریر ہے اور نصف حصہ ان سیاحوں کے سفرناموں کے ضروری خلاصوں پر مشتمل ہے جنہوں نے مصنف سے بہت پہلے شمالی پاکستان کی سیاحت کی، ان میں سے اکثر کے مقاصد گو سیاسی تھے تاہم انہوں نے یہاں کے لوگوں اور یہاں کی زمین کے بارے میں بھی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں اور ان ان جگہوں پر گئے جہاں مصنف اپنے محدود ذرائع کے سبب نہیں جا سکا۔ اس لئے میں نے اپنی گذارشات کے بعد ان حضرات کے سفرناموں سے ایسی معلومات اپنے الفاظ میں اخذ کر لی ہیں جتنی اس کتاب کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں۔''(۱)

رشید اختر ندوی کی اس ضروری وضاحت سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ:

- ☆ مواد کے اعتبار سے یہ ایک مشترکہ تالیف خیال کی جانی چاہیے۔ اس میں نصف مصنف کی تحریر ہے اور نصف حصہ دیگر سیاحوں یا مصنفوں کی تحریروں کے خلاصے پر مشتمل ہے۔
- ☆ ارضِ پاکستان کے شمالی حصوں کی سیاحت کرنے والے سیاحوں کے مقاصد سیاسی ہوتے تھے۔
- ☆ سیاسی مقاصد کے لئے اختیار کئے گئے سفر میں وہ سیاح اپنی روداد قلم بند کرتے ہوئے شمالی علاقوں کے لوگوں اور جغرافیے کے بارے میں ضمناً مفید معلومات بھی درج کر جاتے تھے۔
- ☆ رشید اختر ندوی نے ایسے ہی بعض سیاحوں کی تحریروں سے اخذ و قبول کرتے ہوئے اس تالیف کو مکمل کیا ہے۔

یہ طریقہ کار بنیادی طور پر حصولِ مواد اور تالیف کے منہج کی طرف سے اشارہ کرتا ہے۔ کتاب کی تالیف کے اساسی مقاصد کا بیان رشید اختر ندوی کتاب کے حرفِ آغاز میں کرتے ہیں۔ وہ بطور ایک ارضی مؤرّخ اور بطور ایک سیاح ارضِ پاکستان کے شمالی علاقوں کی جغرافیائی سیاسی وقعت اور اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ایک دانشور کے طور پر اس علاقے کی نازک جغرافیائی سیاسی اہمیت اور افادیت کے احساس میں پڑھنے والے کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس خطہ اراضی کے آئندہ پچاس سالوں کے مفادات کا شعور رکھنے والے ہر پاکستانی کو یہ ادراک ضرور ہونا چاہیے ملک عزیز کے شمالی علاقے مستقبل میں کس قدر اہمیت اور مفاداتی مرکزیت اختیار کر جائیں گے۔ یہ تحریر ۱۹۸۷ء کی ہے۔ اُس دور میں افغان جنگ اپنے اختتام کی طرف رواں دواں تھی۔ اُس وقت شمالی علاقے پُرامن تھے۔ شاہراہِ قراقرم کے ذریعے تجارتی قافلے چین کی طرف اور چین کے قافلے پاکستان کی طرف آ جا رہے تھے۔ اُس دور میں شمالی علاقوں کے ان امکانات میں رخنہ اندازیاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں ہوئیں، یعنی اتفاقی طور پر

شاہراہ قراقرم کے وسط میں، نہایت بلند علاقے میں ایک پہاڑ کے گرنے سے عطا آباد جھیل کا ظہور، کہ جس نے اس عظیم اور رواں دواں شاہراہ کا قریباً ۲۶ کلومیٹر حصہ ہڑپ کرلیا ہے اور پاکستان اور چین کے درمیان سفر کے دوران ایک بہت بڑی اور گہری جھیل بھی عبور کرنی پڑتی ہے۔ پھر اُس دور میں ان پر امن علاقوں میں دہشت گردی کی وارداتیں بھی شروع نہیں ہوئی تھیں، ان وارداتوں کا مقصد بھی اس خطہ ارضی یعنی شمالی پاکستان میں موجود بے پناہ اور بے شمار قدرتی وسائل، جن میں خالص سونے کی کانیں، یورینیم اور قیمتی ترین پتھروں کے وسیع ذخائر اور سو پچاس سال بعد استعمال ہونے والے توانائی کے منابع انہی علاقوں میں موجود ہیں اور پاکستان کے مفادات سے دلچسپی نہ رکھنے والی بین الاقوامی طاقتیں چاہتی ہیں کہ پاکستان اپنے شمالی علاقوں میں موجود ان وسائل سے دور رہے۔

اس خطہ ارضی کی ایک سیاسی اہمیت اس کا محل وقوع ہے یعنی چین، ہندوستان اور روس کے درمیان ایک ایسی تکون جہاں سے ان تینوں ملکوں کی نگرانی کی جاسکتی ہے۔ایک مستقبل شناس دانشور کی طرح رشید اختر ندوی شمالی پاکستان کی اسی اہمیت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تقسیم کے وقت نہ پاکستان کے سیاست دانوں کو یہ معلوم تھا اور نہ ہندوستان کے نیتاؤں کو اس کی خبر تھی کہ ان کے ہمسایہ میں واقع یہ ملک جن مین سے ایک کا نام روس ہے اور دوسرے کا نام چین، ان کے ایسے ہمسائے بن جائیں گے جیسے ہندوستان کا نیپال اور پاکستان کا افغانستان ہے اور ان کی مرضی ان کی سیاست پر اس قدر اثر انداز ہوگی کہ انہیں ہر قدم اُٹھانے سے پہلے سوچنا پڑے گا کہ کہیں ان کے اقدام سے ان کے یہ دو بڑے ہمسائے ناراض نہ ہو جائیں اور ان کے لئے جینا مشکل کر دیں۔''(۲)

گو یا ریاست پاکستان کے علاقائی کردار اور خارجہ حکمت عملی کا ان علاقوں پر ہمارے اختیار اور ان علاقوں میں شروع کئے گئے منصوبوں سے براہِ راست تعلق ہے۔ان علاقوں کی ایک بڑی سیاسی ودفاعی اہمیت پاکستان اور چین کے مابین ایک محفوظ اور رواں دواں زمینی راستہ، شاہراہِ قراقرم ہے۔ یہ شاہراہ چین کو گوادر سے لے کر کراچی تک پھیلے ہوئے ان گرم پانیوں تک بلا رکاوٹ پہنچا دیتی ہے جن تک رسائی مبینہ طور پر سویت روس کے لئے ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔لیکن یہی شاہراہ اپنے ساتھ متعدد دیگر خدشات اور خطرات بھی رکھتی ہے جن پر نظر رکھنا، قابو پانا اور موزوں حکمت عملی اختیار کرنا پاکستان کی حکومتوں کا کام ہے۔رشید اختر ندوی شمالی علاقوں کو نیلے یورپ، سرسبز ایشیاء اور زرد چین کے مابین واحد زمینی راستہ خیال کرتے ہیں۔اس زمینی راستے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تقسیم کے وقت ہندوستانی اور پاکستانی زعما نے ان دونوں ملکوں کی ہمسائیگی کا احساس تو کیا تھا اور اپنی سرحدوں سے ملتی ان کی سرحدوں کی پیائش بھی کی تھی۔مگر یہ بات ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ماضی بعید کی وہ شاہراہ جو کبھی شاہراہ ریشم

کہلاتی تھی اور جس کو پار کرنے کے لئے ہزاروں مصائب و مشکلات کو ماضی کے لوگوں نے برداشت کیا تھا کبھی شاہراہ قراقرم بنا کر ایسی آسان گزر(گاہ) اور آرام دہ سڑک بن جائے گی کہ جس کسی کا جی چاہے گا اپنی موٹر کی ٹینکی میں پڑول بھر کر ایبٹ آباد سے چلے گا اور مانسہرہ سے ہوتا ہوا کسی رکاوٹ کے بغیر، پہلے گلگت پہنچے گا اور پھر چین اور پاکستان کی سرحد خنجراب تک رسائی پالے گا۔"(۳)

شاہراہِ ریشم کے اس زمینی راستے نے اس پورے خطے کی تقدیر پر نہایت دوررس اثرات مرتب کئے ہیں۔ ارض پاکستان کے لئے ان اثرات کو مسلسل مثبت رکھنا دراصل یہاں کی حکومتوں کے عزم، بصیرت اور مہارت پر منحصر تھا اور ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں استقلال صرف ملکی مفاد کو ہوتا ہے بقیہ سب دوستیاں، رشتے اور تعلقات اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ چین کے ساتھ بطور ہمسایہ ہمارے تعلقات اور ان تعلقات میں ارض پاکستان کا مفاد یہ تقاضا کرتا ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت کے صورت گر ملک کی معیشت اور صنعت پر ان تعلقات کے اثرات کی روشنی میں اس شاہراہ کے ذریعے ہونے والی تجارت کے حجم کا تعین کرتے رہا کریں۔ رشید اختر ندوی اس امر کا گہرا شعور رکھتے تھے کہ برِصغیر پر حملہ آور ہونے والی اقوام کوہ ہندوکش، پامیر اور کوہِ قراقرم کے پہاڑی سلسلوں میں واقع درّوں یا راستوں کے ذریعے خطے کے اندر تک رسائی حاصل کر سکے تھے۔ اب یہ دشوار گزار اور بسا اوقات ناقابل عبور پہاڑی سلسلے شاہراہِ قراقرم کی تکمیل کے بعد ہر طرف سے کھل گئے ہیں اور ایک ہمہ وقت چوکس نگرانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ملک کے جغرافیے پر دفاعی، تجارتی اور سلامتی امور کے حوالے سے روشنی ڈالنے والے دانشور اور محقق کے طور پر رشید اختر ندوی کے اشارے بڑے بلیغ اور اس موضوع پر دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑے مفید خیال کئے جا سکتے ہیں۔ وہ شمالی پاکستان کے حرفِ آغاز میں انہی امور کی وضاحت کرتے ہوئے شاہراہِ قراقرم کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''......اور شاہراہِ قراقرم نہ صرف درّہ خنجراب تک رسائی ہی کو آسان بنا دے گی، کوہِ ہندوکش قراقرم اور پامیر کے ان تمام درّوں کے فاصلے بھی حد درجہ کم کر دے گی جن کو عبور کرتے وقت ماضی میں ہزاروں مسافر اپنی جانیں ضائع کر چکے ہیں۔ جغرافیہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ پاکستان کے شمال میں کوہِ ہندوکش، پامیر اور کوہِ قراقرم واقع ہیں اور یہ وہی پہاڑی سلسلے ہیں جن کے درّوں کے اندر سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی ہر قوم نے اس خطہ ارض میں راہ پائی ہے جو پہلے محض ہندوستان کہلاتا تھا اور اب پاکستان اور بھارت میں بٹ گیا ہے۔

بلاشبہ یہاں آنے کیلئے بلوچستان کا درّہ بولان، سرحد کا درّہ خیبر، درّہ کرم اور گومل

بھی استعمال ہوا ہے مگر معلوم تاریخ کی یہ گواہی بڑی مستند ہے کہ درّہ خیبر کو چھوڑ کر باقی درّے بہت کم استعمال ہوئے۔ زیادہ تر قومیں خصوصاً ماضی بعید کی وہ قومیں جن کے اندر طوفانوں اور سیلابوں کے سے حوصلے تھے ان ہی درّوں کے اندر سے اُتریں جو اس وقت شمالی پاکستان کے سرحدی درّے ہیں اور جنہیں شاہراہِ قراقرم نے ارضِ پاکستان کی شاہ رگ کی حیثیت دے دی ہے۔''(۴)

تاریخ پاکستان کی ایک ادنیٰ طالبہ کی حیثیت سے میں جانتی ہوں کہ ملک ہمیشہ اپنی ''شاہ رگ'' کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔ ارضِ پاکستان کے حوالے سے کشمیر کو شاہ رگ قرار دیا گیا، نتائج سب کو معلوم ہیں لیکن شکر ہے شمالی پاکستان کے علاقے اگر شاہ رگ خیال کئے جاتے ہیں تو ابھی تک کسی بڑے امتحان کا باعث نہیں بنے سوائے اس کے کہ ابھی تک ہماری کوئی بھی حکومت ان علاقوں کے وسائل سے کم حقہ استفادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ شاہراہِ ریشم ایک بڑا اور مثالی کارنامہ ضرور ہے لیکن اس امر پر ایک محتاط تحقیق کی ضرورت ہے کہ اس شاہراہ کی تعمیر کے بعد پاکستان کی صنعت وتجارت کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے؟ اور کیا پاکستان چین میں بنی ہر طرح کی اشیاء کا ایک بے ہنگم بازار بن کر نہیں رہ گیا؟ رشید اختر ندوی نے واضح طور پر نشاندہی کی ہے کہ ماضی بعید میں وہ اقوام جن کے اندر 'طوفانوں اور سیلابوں' جیسے حوصلے تھے ان میں درّوں یعنی پہاڑی راستوں کے ذریعے وارد ہوئے تھے یوں ان شمالی علاقوں کی حیثیت محض سیاحتی نہیں رہ جاتی۔ ''شمالی پاکستان'' میں رشید اختر ندوی انہی امور کی طرف بہ اصرار متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا بنیادی اصرار اس بات پر ہے کہ شمالی علاقوں کو محض مقبول سیاحتی علاقے شمار نہ کیا جائے، دیگر لوگوں کے لئے شاید ایسا ہی ہو، لیکن پاکستان کے لئے ان علاقوں کی جغرافیائی وسیاسی حیثیت بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ رشید اختر ندوی مسلسل اس طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ شمالی پاکستان کے حرفِ آغاز کا حتمی استدلال یوں رقم کرتے ہیں:

''یہاں ہم آپ سے صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کا یہ شمالی حصہ جو وادئ ہنزہ، وادئ نگر، چیلاس، بونجی، وادی چھور بٹ، وادئ شگر، اسکردو، وادئ چتلو، وادئ اشکومن، وادئ کھر منگ، وادئ داریل، وادئ تانگیر اور یلیین پر مشتمل ہے، سیاسی اعتبار سے پاکستان کی شاہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ یورپ کے ہزاروں سیاح جو یہاں ہر سال آتے ہیں وہ اس کے، کے۔ٹو، اس کے راکاپوشی، اس کا بلترو، اس کے بتورہ، اس کے نانگا پربت، اس کے التر، اس کے ہوسپر، اس کی سنہری چوٹی، اس کے سلترو، اس کے رکشہ بروم، بیافو، باشہ، قمری، بابوسر، بگروٹ، حراموش، گاشو پھوٹ، چھپروٹ، مگر، اشکوسن، تھوئی، درکوٹ اور خنجراب گلیشیئر کی آب وتاب اور

رعنائی سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں،انہیں اس شمالی حصہ کی سیاسی حیثیت سے کوئی غرض نہیں ہے۔اور کسی بھی حکومت پر جو بھی پاکستان میں برسرِ اقتدار آئے اس شمالی علاقہ کی دیکھ بھال ویسی ہی ضروری ہے جیسی کہ اسلام آباد کی۔''(۵)

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد جیسی دیکھ بھال سے شمالی علاقوں کی حقیقی اہمیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۱۰ جنوری ۱۹۸۷ءکومکمل اور ۱۹۹۰ءکو شائع ہونے والی تصنیف ''شمالی پاکستان'' کل دس ابواب پر مشتمل ہے۔جیسا کہ ذکر ہوا فاضل مؤلف نے کتاب کے آغاز میں ایک ضروری وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس تالیف کا نصف حصہ مصنف کے اپنے مشاہدات اور اپنی تحریر ہے جبکہ بقیہ نصف ان علاقوں کے سفرناموں کے خلاصے یا اجزاء پر مشتمل ہے جوان علاقوں کے سیاحوں نے قلم بند کررکھے ہیں۔شمالی پاکستان کا علاقہ دشوارگزار پیچیدہ اور بلند جغرافیہ رکھتا ہے۔یہاں کا سفر اختیار کرنا زیادہ ہمت اور بڑے حوصلے کا تقاضا کرتا ہے۔رشید اختر ندوی نے بڑی عمر میں خود ان کے اپنے مطابق سفید بالوں کو رنگ کرکے، گویا خود کو جوان ثابت کرتے ہوئے ان شمالی علاقوں کا محفوظ اور محتاط سفر اختیار کیا تھا۔اس سفر کے احوال دوسرے باب کی فصل۲ میں دریائے چلاس کی سیر کے حوالے سے،تیسرے باب کی فصل ا میں گلگت آمد کے حوالے سے،فصل ۲ میں گلگت شہر کے تفصیلی تعارف پر، باب۴ میں ہنزہ کے حوالے سے، پانچویں باب میں درّہ خنجراب اور سوست کی کسٹم پوسٹ تک اور پھر چھٹے باب میں گلگت سے سکردو کے اطراف کی تفصیلات میں بیان ہوا ہے۔ان سب ابواب اوران کے مندرجات میں تاریخ،تمثیل اور ناول نگاری آپس میں ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔رشید اختر ندوی کے بیانیے میں بعض مقامات پر رومانی ناول کی کوئی دلکش تصویر نظر آجاتی ہے۔چند مثالیں دیکھتے ہیں۔کتاب کے تیسرے باب کی فصل دوم میں 'دریائے گلگت کے احوال میں' میں فاضل مؤلف کا انداز دیکھئے:

''...... مجھے گلگت دریا بالکل بغداد کے اندر بہتا دریا دجلہ سرینگر کے درمیان بہتا دریا جہلم اور لندن کا دریائے ٹیمز محسوس ہوا۔اگر کبھی گلگت شہر کو آباد کرنے والے کوئی صورت ایسی ماضی میں نکال لیتے کہ ان کے دونوں کناروں پر اپنی بستیاں آباد کرلیتے تو یہ بھی سری نگر اور بغداد اور لندن کے باشندوں ایسے فوائد پاتے۔ان میں شکارے بھی چاندنی راتوں میں رواں دواں رہتے اور اس کے کناروں پر ویسے ہی ہاؤس بوٹ ہر وقت کھڑے نظر آتے جیسے جہلم دریا میں کھڑے رہتے ہیں اور باہر کے سیاح وہاں آن کر زندگی کا ہر لطف اُٹھاتے ہیں۔

یقین جانئے گا،میری جتنی بھی شامیں اور صبحیں گلگت دریا کے کناروں پر گزریں بڑی ہی دل فریب تھیں۔یوں مجھے گلگت دریا سے ایک شکایت ہے کہ حالانکہ اس کا دامن پانی کے

بے بہا ذخیروں سے بھرا ہے مگر یہ اپنے ان ذخیروں کو دریائے نیل کی طرح اپنے کناروں پر اچھالتا نہیں ہے کہ اس کے کناروں کے قریب کی زمینیں سبزہ زاروں اور گلستانوں میں خود کو ڈھال لیں۔ یہ بڑا ہونے کے باوجود سخت کنجوس اور بڑا بے فیض ہے۔ یہ اپنے ذخیروں کو اپنے ساتھ لئے دریائے سندھ کی گود میں جا گرتا ہے اور اپنا وجود کھو دیتا ہے۔" (۶)

اسی طرح باب ۴ کی فصل ۱ میں میر آف ہنزہ میر غضنفر کے محل میں مصنف کے ورود اور بڑی رانی صاحبہ سے ملاقات کا یہ حال دیکھئے۔ یہاں ناول نگار کا قلم تاریخ نویس کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

"محل گو مغلئی محل نہ تھا مگر بہر حال چھ سو سال تک ہنزہ ایسی خوبصورت ریاست پر حکمران رہنے کے بعد معزول ہونے والے میر آف ہنزہ کا محل تھا۔ محل کے بڑے دروازے پر ہمیں داروغہ محل نے خبر دی کہ میر غضنفر تو محل پر موجود نہیں ہیں البتہ بڑی رانی صاحبہ ہمیں شرف باریابی بخشیں گی۔ دارغہ محل ہمیں دربار ہال میں بٹھا کر رانی صاحبہ کو ہماری خبر دینے چلے گئے تو میں نے اور خان بہادر صاحب نے اس دربار ہال کا نظارہ کیا۔ یہ بڑا نفیس ہال تھا۔ عمدہ اخروٹ کی لکڑی زیادہ استعمال ہوئی تھی اور ہر چیز سے سلیقہ ٹپکتا تھا۔ رانی صاحبہ تشریف لے آئیں تو ہم دونوں اُٹھے، انہیں سلام عرض کیا، ان سے اپنے آنے کی غرض بیان کی کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ کے ہاں ہنزہ ریاست اور شمالی علاقہ پر بڑے مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ پھر میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور ان سے عرض کیا کہ میں ارض پاک کے نام سے ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس کے چار اجزاء مکمل کر چکا ہوں، صرف شمالی علاقہ کے بارے میں لکھنا باقی ہے اور آپ جانتی ہیں کتابوں کی مدد کے بغیر کوئی تاریخی کتاب لکھی نہیں جا سکتی۔ رانی صاحبہ مسکرائیں فرمایا' آپ بجا کہتے ہیں مگر کتابوں کی الماریوں کی کنجیاں غضنفر کے پاس ہیں اور وہ کل صبح یہاں ہوں گے آج اسلام آباد ہیں، آپ کل آیئے'۔ یہ فرمایا اور اوپر کو اُٹھ گئیں اور داروغہ محل سے کہہ گئیں انہیں چائے پلا دیجئے۔ خان بہادر اے سی تھے اور میں پچاس کتابوں کا مصنف ہوں، میں نے حضرت قائدِ اعظمؒ کے دربار میں بھی رسائی پائی ہے، غلام محمد گورنر جنرل جیسے آدمی سے بھی مل چکا ہوں، جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی جی سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صدر بھارت کا تو چار سال تک شاگرد رہ چکا ہوں۔ میں نے خان بہادر صاحب کی طرف دیکھا اور خان بہادر صاحب نے میری طرف اور پھر داروغہ محل کے اصرار کے باوجود ہم وہاں نہیں رکے۔" (۷)

اسی تسلسل میں فاضل مؤلف اُلتر گلیشئر اور ایک خاتون سویڈش ڈاکٹر سے ملاقات کا حال اس انداز میں

بیان کرتے ہیں کہ اُردو کے صاحب طرز سفر نامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب یاد آ جاتا ہے۔

''یہ چاندرات تھی اور اس چاندرات میں، میں نے اس ہوٹل کے لان میں کھڑے ہو کر پہلے دائیں سمت کی فضا میں پھر بائیں طرف اور پھر عقب کی سمت جو حسین منظر دیکھا اسے میں نے اپنی زندگی میں نہ کبھی پہلے دیکھا تھا اور نہ کبھی آئندہ شاید دیکھ سکوں۔ میری دائیں طرف دو سیاہ بلند پہاڑوں کے عین وسط میں اُلتر گلیشئر اس طرح چمک رہا تھا جیسے ساری کائنات کی رعنائیاں اور دلفریبیاں اسی کے دم سے قائم ہیں۔ اس کی چمکتی دمکتی برف مجھے اس طرح لگ رہی تھی جیسے لاکھوں پریاں ایک دوسرے میں ضم ہو کر فضا میں اُبھر آئی ہیں۔ کیا حسن تھا، کیا رعنائی تھی اور کیا دل فریبی و دل آویزی تھی کہ میں نہ جانے کتنی مدت تک وہاں کھڑا ایک ہی سمت دیکھتا رہا کہ دفعتاً کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بہت زور سے ایک نسوانی قہقہہ فضا میں اُبھرا۔ یہ میری ہمسائی سویڈش ڈاکٹر تھیں جو کوئٹہ کے ہسپتال سے اس ہوٹل میں آن کر مقیم ہوئی تھیں۔۔۔''(۸)

چاندرات میں اُلتر گلیشئر اور راکاپوشی گلیشئر کے مناظر کی دلکش تصویر کشی کی مثال شاید رشید اختر ندوی کے کسی رومانی ناول میں بھی نہ ملے، حسن کا احساس انہیں دیوانہ بنا دیتا ہے اور اپنی اس دیوانگی کو دلفریب تمثیل کا پیکر عطا کر کے بیان کرنے کا ہنر وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ رشید اختر ندوی کا یہی اسلوب، بیان اور منظر نگاری کا یہی کمال 'شمالی پاکستان' کا اصل حسن ہے ورنہ باقی جو کچھ بھی ہے وہ اخذ معلومات اور بعض مشاہدات خیال کئے جا سکتے ہیں۔

<u>شمالی پاکستان</u> کے بقیہ ابواب میں (ساتویں باب سے دسویں باب تک) رشید اختر ندوی نے ارض پاکستان کے شمالی علاقوں کی سیاحت کر کے احوال رقم کرنے والے سیاحوں کی تصانیف کے خلاصے اور ضروری اجزاء شامل کئے ہیں۔ یہ سیاح اور ان کی تصانیف کے ملخص اس طرح سے ہیں، سب سے پہلے ساتویں باب سے رشید اختر ندوی نے یہ سلسلہ بہ ترتیب ذیل **<u>شمالی پاکستان</u>** کے دسویں باب تک شامل کیا ہے۔ ساتویں باب میں اس کے آغاز کا اعلان یوں کرتے ہیں:

''ہم سے پہلے جن سیاحوں نے شمالی پاکستان کی سیاحت کی اور مختلف مقامات پر پہنچے اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا، ہم ان میں سے ایسے حصوں کا اختصار اگلے صفحات پر پیش کر رہے ہیں تا کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ کارآمد بن جائے۔''(۹)

اس کے بعد تصانیف کی تلخیص شروع ہوتی ہے۔ ''سب سے پہلے فریڈرک ڈریو کے سفر نامہ کا اختصار ملاحظہ ہو

۱۔ فریڈرک ڈریو: فریڈرک ڈریو نے ۱۸۷۵ء میں جموں اور کشمیر کے عنوان سے جو کتاب تصنیف کی وہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ لدّاخ کے راستے سے جب بلتستان میں داخل ہوا تو یہاں ابھی انگریز نہیں آئے تھے

اس لئے اس کا یہ سفر ایک انگریز افسر کا سفر نہ تھا ایک سیّاح کا سفر تھا اور اس کی تحریر ایک مؤرّخ اور مبصر کی تحریر ہے۔"(۱۰)

۲۔ بڈلف کے ٹرائبز آف ہندوکش کا ضروری اختصار، ۱۸۷۸ء۔(۱۱)

۳۔ ای اولور میر کے سفرنامہ لینگو تیج ہنٹنگ ان دی قراقرم کا اختصار، ۱۸۹۱ء۔(۱۲)
کتاب کا آٹھواں باب اسی تلخیص پر مشتمل ہے۔

۴۔ ای ایف نائٹ کا سفرنامہ وئیر تھری امپائرز میٹ کا اختصار، ۱۸۹۱ء۔(۱۳)

۵۔ آرسی سچومبرگ کے سفرنامہ بیٹوین آکس اینڈ انڈس کا ضروری اختصار۔(۱۴)

۶۔ بربرہ موئز کی ہائی روڈ ٹو ہنزہ کا اختصار۔(۱۵)

۷۔ ملٹن ہوف مین پی ایچ ڈی کے سفرنامہ کا اختصار۔(۱۶)

رشید اختر ندوی نے اس جزوی تلخیص سے پہلے وضاحت کی ہے کہ:

"یہ امریکن سیاح ۱۹۶۱ء کے ماہ جولائی میں کینڈی ایئر پورٹ سے پرواز کر کے نیو دہلی کے راستے اگست میں کراچی پہنچا اور راولپنڈی سے ہوائی جہاز کے ذریعے گلگت تک رسائی پائی اور اپنے سفر کا آغاز کیا۔"(۱۷)

۸۔ ڈرولہ مارفی کا سفرنامہ 'وئیر انڈس از ینگ' کا خلاصہ۔(۱۸)

یہاں بھی رشید اختر ندوی مختصر وضاحت درج کرتے ہیں:

"وہ ۱۹۷۵ء میں سکردو پہنچیں اور اس کی وادی کی سیاحت کی حالانکہ موسم بہت ٹھنڈا تھا اور راستے ناہموار تھے۔اس کے باوجود ہر اس جگہ گئیں جہاں تک وہ جا سکتی تھیں"۔

مذکورہ بالا آٹھ سفرناموں کی تلخیص اگرچہ کتاب کے مرکزی موضوع سے منسلک ہے۔لیکن ان آٹھ خلاصوں کو ان تصانیف کے مربوط خلاصے شمار نہیں کیا جا سکتا۔رشید اختر ندوی نے ان کتب کے بعض منتخب اجزاء کے معانی اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔اس طرح گویا انہوں نے ان آٹھ سیّاحوں کے تجربے اور مشاہدے میں، متفرق طور پر سہی اپنے قاری کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔تلخیص نویس کے طور پر رشید اختر ندوی تسلسل سے مصنف کا حوالہ دہراتے رہتے ہیں، وہ نہایت عمدہ نثر لکھتے ہیں، اور قیاس چاہتا ہے کہ دوران تلخیص مصنفین کا یہ تکرار ذکر اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی تحریر طبع زاد خیال نہ کی جائے۔یہ علمی دیانت کی ایک عمدہ مثال خیال کی جا سکتی ہے۔

حواشی وحوالے

۱۔ رشید اختر ندوی، ''شمالی پاکستان''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۲ء، ص ۱۷

۲۔ ایضاً،ص۱۳ ۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً،ص۱۴ ۵۔ ایضاً،ص۱۶

۶۔ ایضاً،ص۴۳ ۷۔ ایضاً،ص۷۷،۷۸ ۸۔ ایضاً،ص۷۹تا۸۱ ۹۔ ایضاً،ص۱۷۱

۱۰۔ ایضاً ۱۱۔ ایضاً،ص۲۰۱ ۱۲۔ ایضاً،ص۲۲۳ ۱۳۔ ایضاً،ص۲۴۹

۱۴۔ ایضاً،ص۲۶۱ ۱۵۔ ایضاً،ص۳۰۵ ۱۶۔ ایضاً،ص۳۱۷ ۱۷۔ ایضاً،ص۳۱۶

۱۸۔ ایضاً،ص۳۳۴